ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، ۲۲/۱، جنوری-جون ۲۰۰۷ء

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی تصنیف ''فہم قرآن''
ایک مطالعہ

ضیاء الدین فلاحی

مولانا سعید احمد اکبرآبادی (نومبر ۱۹۰۸-مئی ۱۹۸۵ء) بیسویں صدی کے ان ممتاز علماء ودانشوروں میں شمار کیے جاتے ہیں جو قدیم نافع اور جدید صالح کے سنگم تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، بعد ازاں مدرسہ شاہی مرادآباد اور دارالعلوم دیوبند میں دینی تعلیم کے اعلیٰ مراحل طے کیے۔ اورینٹل کالج لاہور اور سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی سے عصری تعلیم کی تکمیل کی۔ تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد وہ تاحیات علم کی خدمت بالخصوص علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت میں منہمک رہے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر اور ڈین فیکلٹی آف دینیات، کالی کٹ یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر اور آخر عمر میں شیخ الہند اکادمی، دیوبند کے ڈائریکٹر کے منصب پر فائز ہوئے۔ علمی مصروفیات کے تحت مولانا نے مختلف ملکوں کا سفر کیا اور محاضرات وخطبات کے ذریعہ اپنے وسعت مطالعہ اور علم وفضل کا سکہ جمادیا۔ مولانا کو ۱۹۷۵ء میں عربی زبان وادب میں گراں قدر خدمات کے صلہ میں صدر جمہوریہ ایوارڈ عطا ہوا۔ سیاسی ذوق کی وجہ سے آپ کو آل انڈیا مسلم کنونشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ مزید برآں مولانا اکبرآبادی ۴۷ برس تک معروف ومشہور اردو رسالہ ''برہان'' کی ادارت فرماتے رہے۔ اس کے علمی وتحقیقی معیار کو بلند کرنے میں مولانا کا بہت اہم کردار رہا ہے، انہوں نے مختلف موضوعات پر بیش بہا کتابیں تصنیف فرمائیں۔ یہ تصنیفات موضوعات کے تنوع کے علاوہ بصیرت وجامعیت سے بھرپور اور ان کے ناقدانہ نقطۂ نظر کی عکاس

ہیں۔ان کی مطبوعہ کتب درج ذیل ہیں:

(۱) الرق فی الاسلام یعنی اسلام میں غلامی کی حقیقت (۲) موالی (الرق فی الاسلام کی دوسری جلد شایع شدہ بعنوان ''غلامانِ اسلام'') (۳) فہم قرآن (۴) وحی الٰہی (۵) مسلمانوں کا عروج وزوال (۶) صدیق اکبرؓ (۷) عثمان ذوالنورینؓ (۸) کتاب دینیات (۹) اسلامی عبادات اور اخلاقی تعلیمات (۱۰) ہندوستان کی شرعی حیثیت (۱۱) چار علمی مقالات (۱۲) مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد (۱۳) مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم۔ سیرت، شخصیت اور علمی وعملی کارنامے (۱۴) خطبات اقبال پر ایک نظر۔!

''فہم قرآن'' مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی ایک اہم تصنیف ہے۔اس کتاب کے بیشتر حصے اولاً ماہنامہ برہان میں قسط وار شائع ہوئے تھے۔مولانا نے ان مقالات پر نظر ثانی کی اور ترمیم واضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں مرتب کیا جو پہلی بار ندوۃ المصنفین، دہلی سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔اس مقالہ میں طبع ثانی (۱۹۴۵) سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مولانا کی قرآنی بصیرت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مذکر (القمر/۱۷) اس کتاب کا مرکزی عنوان ہے۔ اس آیت کریمہ کے حوالے سے کلام الٰہی کے آسان ہونے کا مفہوم واضح کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کے آسان وعام فہم ہونے کے مفہوم میں عصر جدید کے بعض اصحاب علم نے عجیب وغریب معنی نکالنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں علوم عربیہ میں مہارت اور ذوق قرآنی کا اکتساب بے معنیٰ ہوکر رہ گیا تھا۔مصنف گرامی اس کتاب کی تصنیف کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ہمارے زمانے میں ایک غلط فہمی یہ پھیلا دی گئی ہے کہ قرآن وید کی طرح کوئی ایسی کتاب نہیں جس کا علم کسی خاص طبقہ تک محدود ہو بلکہ وہ ایک آسان کتاب ہے اس کا نتیجہ یہ ہورہا ہے کہ آج ہر شخص اپنی بساط علمی اور استعداد فکری کے مطابق قرآن کی کسی آیت کے جو معانی چاہتا ہے متعین کرلیتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دینے لگتا ہے۔اس بنا پر اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ان دونوں مسئلوں کی تنقیح کرکے یہ صاف صاف بتادیا جائے کہ:

(۱) کیا قرآن آسان ہے؟ اور اگر ہے تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا وہ عربی کی معمولی شدبد سے سمجھ میں آسکتا ہے اور ہر شخص کو اس سے استخراجِ احکام واستنباط مسائل کا حق حاصل ہوسکتا ہے۔

(۲) اور اگر قرآن کے فہم کے لیے صرف عربی کی معمولی استعداد کافی نہیں ہے تو اب یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اور کون سے شرائط ہیں جن کی تکمیل کے بغیر کسی شخص کو فہم قرآن کا ادعاء جائز نہیں، اس وقت آپ کے ہاتھوں میں جو کتاب ہے اس کا موضوع انہیں دونوں مسئلوں پر بحث کرنا ہے۔[۲]

یہاں یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے **الفوز الکبیر فی اصول التفسیر** تصنیف فرما کر اصول تفسیر کے باب میں نہایت اہم کارنامہ انجام دیا۔ بیسویں صدی کے جن علماء قرآن نے اصول تفسیر کو اپنی دلچسپی کا خاص موضوع بنایا۔ ان میں ایک نمایاں نام علامہ حمید الدین فراہیؒ (م ۱۹۳۰ء) کا ہے۔ ان کی متعدد کتب **فاتحہ نظام القرآن**، **دلائل النظام**، **اصول التاویل** میں زیادہ تر اصول تفسیر کے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ ان کے علاوہ اس باب میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مفتی محمد تقی عثمانیؒ، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ، اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ نے بھی اس وادی کی بعض مشکلات کی عقدہ کشائی کی ہے، مولانا امین احسن اصلاحی کی تصنیف ''مبادی تدبر قرآن''[۳] میں اصول تفسیر پر بڑے مفید مباحث ملتے ہیں۔ پہلے انہوں نے فہم قرآن کے لیے چند ابتدائی شرطیں بیان فرمائی ہیں مثلاً نیت کی پاکیزگی، قرآن کو ایک برتر کلام تسلیم کرنا، قرآن کے تقاضوں کے مطابق اپنے طرز عمل کو بدلنے کا عزم۔ تدبر قرآن کے ضمن میں تقوی اور عمل کو انہوں نے خاص اہمیت دی ہے۔ اس کتاب کے دیگر عنوانات یہ ہیں: قرآن کی تفسیر خود قرآن سے، شان نزول، نظم قرآن، کلام عرب، نحو، فن بلاغت، محدثین، متکلمین، مقلدین اور متجددین کا طریقہ اصول تفسیر۔

زیر مطالعہ کتاب ''فہم قرآن'' ۱۲۸ ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ پہلی بحث

''تدوین حدیث'' سے متعلق ہے۔ لیکن اس سے قبل ایک طویل مقدمہ ہے جو کتاب کا مغز ہے۔ ۸۴ صفحات پر مشتمل اس مقدمے میں صاحب کتاب نے منہج فہم قرآن کے ناقص تصور کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کے صحیح تصور کی وضاحت کی ہے۔ فاضل مصنف نے قرآن وسنت کے باب میں مستشرقین کی تحریفات وغلط ترجمانی کا تنقیدی جائزہ لیا ہے ان کی اسلام دشمنی اور زبانی وبیانی تحریفات کے نتیجہ میں قرآن وسنت، علماء وجہاد، اور مدارس و مساجد کے تعلق سے خود مسلمانوں کے بعض حلقوں میں جو فکری کجی آ گئی تھی اس سے متنبہ کرتے ہوئے مولانا اکبر آبادی نے اصلاح احوال کی دعوت دی ہے، مزید برآں اس کتاب میں اصول حدیث کے اہم مباحث، علم اسماء الرجال کے آغاز وارتقاء اور فتنہ وضع حدیث پر بھی نہایت عالمانہ ومحققانہ بحث ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بحثیں فہم قرآن کے مسائل کے ضمن میں آئی ہیں تاہم انہیں پڑھتے ہوئے ایک قاری کو احساس ہوتا ہے کہ یہ کچھ زیادہ طویل ہوگئی ہیں۔

مباحث فہم قرآن کا تفصیلی مطالعہ:

مصنف گرامی نے فہم قرآن کی مراد ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے: فہم قرآن سے غرض یہ ہے کہ انسان مجتہدانہ طور سے احکام کا استنباط کر سکے، قرآن کی کسی آیت کو پڑھ کر اس کے واقعات اور حقیقی مفہوم کو متعین کر سکے اور اس کے معیار بلاغت کو دریافت کر کے یہ سمجھ سکے کہ یہاں کلام کا مقتضائے حال کیا ہے اور کس چیز پر زیادہ زور دینا منظور ہے، اس کا مدلول مطابقی اور مدلول التزامی کیا ہے اور یہاں کیا مراد ہے، تو یہ بات یقینی ہے کہ اس مراد وغرض کے اعتبار سے فہم قرآن کسی ترجمہ کے دیکھ لینے سے حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے خاص خاص شرائط وآداب ہیں کہ جب تک کہ وہ نہ پائے جائیں کوئی شخص فہم قرآن کا مدعی نہیں ہوسکتا''[۴]

مصنف گرامی نے اس مسئلے سے بھی بحث کی ہے کہ قرآن مجید کی تمام آیات یکساں نہیں ہیں بلکہ مراد کے مخفی اور واضح ہونے کے اعتبار سے ان میں باہمی فرق ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض آیات کی مراد اللہ کے سوا صرف ''علماء راسخین'' کو معلوم ہو سکتی ہے، ہر شخص خواہ عالم راسخ ہو یا نہ ہو ان آیات کی مراد تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ دوسری اہم بات اس کتاب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ کتاب الٰہی میں زندگی کے تمام مسائل کے لیے جزوی تفصیلات مذکور نہیں ہیں چنانچہ حکمت خداوندی کا اقتضاء یہی ہونا چاہیے تھا کہ آخری کتاب سماوی میں زندگی سے متعلق صرف اصول بیان کیے جائیں اور ان کی جزئیات سے تعرض نہ کیا جائے چنانچہ فہم قرآن کا یہ پہلو نگاہ کے سامنے رہنا چاہیے کہ اصول سے فروع اور کلیات سے جزئیات کے استخراج واستنباط کی اہلیت وصلاحیت اور استعداد ہو، اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ استنباط مسائل اور استخراج مسائل میں لوگ یکساں صلاحیت واستعداد کے مالک نہیں ہو سکتے اس بنا پر ان میں باہمی فرق مراتب بھی ہوگا حتی کہ صحابہ کرام بھی فہم قرآن میں برابر نہیں تھے۔ مولانا اکبر آبادی فرماتے ہیں:

''یہی وجہ ہے کہ ہم عجمیوں اور خیر القرون سے اس درجہ بُعد رکھنے والوں کا کیا ذکر؟ خود صحابہ کرام جو بلاواسطۂ غیرے نبوت کی زبان حق ترجمان سے قرآن مجید سنتے تھے، اہل لسان و صاحب زبان تھے اور جن کے سینے آفتاب جہاں تاب رسالت کی شعاعوں سے براہ راست منور تھے، فہم قرآن کے مرتبہ میں یکساں حیثیت کے مالک نہیں تھے،۵ تفسیر قرآن کے معاملہ میں صحابہ وتابعین حد درجہ محتاط تھے اس کی وجہ یہ تھی تفسیری اہلیت کے لیے جن صفات واوصاف کی ضرورت ہے یہ حضرات ان میں خواہ کیسا ہی مرتبہ کمال رکھتے ہوں، انہیں تفسیر قرآن کی عظیم واہم ذمہ داری کے پیش نظر اپنے اوپر پورا بھروسہ نہیں ہوتا تھا اور اس وجہ سے اس باب میں جسارت سے کام لیتے ہوئے ان کو تردد ہوتا تھا اور حتی الوسع اس سے سبکدوش رہنا چاہتے تھے، یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ صحابہ کرام تفکر وتدبر ضرور کرتے تھے جیسا کہ قرآن کا فرمان ہے تاہم ذاتی رایوں کے اظہار سے گریز کرتے تھے کہ کہیں کوئی غلط رائے نہ ظاہر ہو جائے۔۶

''فہم قرآن'' میں فہم قرآن کے لیے موصوف گرامی نے چار شرائط کی وضاحت فرمائی ہے، جن کا قدرے تفصیلی ذکر اس کتاب کی افادیت کو مزید واضح کرے گا۔

۱-عربیت کا ذوق : چونکہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا اس لیے اس زبان کا جاننا بنیادی شرط ہے اور معرفت قرآنی محض دیگر زبانوں سے ترجمہ کے ذریعہ نہیں حاصل ہوسکتی۔ فہم قرآن کے لیے عربی دانی کافی نہیں بلکہ عربیت کا ذوق درکار ہے جو محض مقامات حریری، دیوان متنبی اور دیوان حماسہ یا ایم اے عربی کورس پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ مولانا فرماتے ہیں: ذوق سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو عربی کلام پڑھتے وقت وہی لذت وسرور حاصل ہو جو اس کو خود اپنی زبان کا اچھا شعر سن کر حاصل ہوتا ہے۔ وہ عربی کے تمام محاورات، ان کے مواقع استعمال سے پورا واقف ہو، ایک مفہوم کو مختلف طریقہائے بیان سے ادا کیا جاسکتا ہے، وہ جانتا ہو کہ ایک طریقہ کو دوسرے طریقہ بیان پر کیا فوقیت حاصل ہے۔ ے مولانا نے اس شرط کی مزید وضاحت بعض ذیلی سرخیوں میں کی ہے مثلاً ہر کلام کا صحیح مفہوم ایک ہی ہوتا ہے، بلاغت کے مختلف مدارج ومراتب ہوتے ہیں، دنیوی امور میں ماہرین کی طرف مراجعت کی جاتی ہے۔

۲-نور بصیرت یا ذوق قرآنی: دنیا کا کوئی علم وفن ایسا نہیں ہے جس میں کمال اور مجتہدانہ نظر پیدا کرنے کے لیے عام فطانت وذکاوت کے علاوہ اس علم کے ساتھ ایک فطری لگاؤ ضروری نہ ہو۔ کسی فن کے ساتھ خاص دلچسپی کی وجہ سے اس کی نظر بیگانہ کی نہیں بلکہ آشنائے دیرینہ کی نظر ہوتی ہے چنانچہ یہ بات بالکل درست ہے کہ قرآن مجید کو ہر شخص حضرت ابن عباسؓ یا ابن عمرؓ یا ابن مسعودؓ کی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ شرط اول کسبی ہے جب کہ شرط دوم وہبی ہے، علامہ رشید رضا نے حضرت علیؓ کے قول سے اس کا وہبی ہونا ثابت کیا ہے۔ ۸

این سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اس مقام پر صاحب کتاب نے بہت عمدہ مثال پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں:

علی گڑھ سے ہزاروں نے بی اے اور ایم اے کا امتحان پاس کیا لیکن محمد علی مرحوم کی طرح انگریزی کے بہترین ادیب کتنے پیدا ہوئے۔ دیوبند نے ہزاروں علماء کو سند فراغت تقسیم کی لیکن ان میں ایسے کتنے ہیں جو حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہؒ کی سی

بصیرت رکھتے ہوں۔۹

۳۔اتقاء: مولانا اکبرآبادی فرماتے ہیں:

اتقاء سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص روحانی اعتبار سے اس بات کی صلاحیت رکھتا ہو کہ کلام الٰہی سن کراس کا اثر قبول کر سکے، ظاہر ہے کہ کوئی دوا کتنی ہی مفرح اور مقوی ہو لیکن اگر جسم تندرست نہیں ہے اور معدہ وجگر کے فاسد ہونے کی وجہ سے قوت ہاضمہ بے کار اور تولید دم کی صلاحیت مفقود ہوگئی ہے تو وہ دوا اپنا اثر نہیں کرسکتی بلکہ بسا اوقات مضر نتائج کے پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے، اس پر عالم روحانی ونفسانی اور اس کے امراض وطرق علاج کو قیاس کرلینا چاہیے۔اس شرط کی وضاحت میں مولانا اکبرآبادی نے شیخ بوعلی سینا کی مشہور کتاب ''اشارات'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس نے آخر میں اپنے شاگرد کو بڑے زور سے نصیحت کی کہ: میری یہ کتاب ہر شخص کو نہ پڑھائی جائے بلکہ ان ہی لوگوں تک اس کو محدود رکھا جائے جو اہل جدل وسفسطہ نہیں ہیں اور اگر اس کے خلاف کیا گیا تو میں خدا کے یہاں تمہارا دامن پکڑوں گا پس اس طرح قرآن مجید کے مطالب کو واقعی طور پر سمجھنے کے لیے علوم وفنون کی دستگاہ اور زبان عربی کے لطیف ذوق کے علاوہ تیسری اہم چیز اتقاء ہے۔۱۰

اس شرط کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف گرامی نے صحیح مسلم کی ایک حدیث سے استدلال کیا ہے **القرآن حجة لک او علیک** قرآن تیرے حق میں دلیل بن کر مفید ہے یا تجھ پر حجت ہے،

۴۔فہم قرآن کے لیے چوتھی شرط یہ ہے کہ ایک آیت میں ایک لفظ کو دیکھ کر ہی اس کی تفسیر وتاویل کی جرأت نہ کی جائے بلکہ تمام قرآن مجید کا مطالعہ بنظر عمیق کر کے قرآن کی زبان اور اس کے طرز ادا وطریقہ بیان کے ساتھ ایک ایسی مناسبت پیدا کر لی جائے کہ تعیین مراد میں کوئی دشواری پیش نہ آئے اور ایک جگہ کسی لفظ کے جو معنی مراد لیے گئے ہوں وہ کسی دوسرے مقام کے منافی نہ ہوں، مزید براں وہ یہ بھی واضح فرماتے ہیں کہ جس طرح قرآن مجید کے مفرد الفاظ کے معنی کی تعیین کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ لفظ قرآن میں جہاں جہاں آیا ہے ان سب مواقع کو پیش نظر رکھا جائے اسی طرح کسی آیت

سے کوئی حکم استنباط کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ احکام قرآنی میں بصیرت حاصل کرنے کے لیے مماثل احکام پر ان کے سیاق وسباق کے ساتھ مبصرانہ نگاہ ڈال کر اصل روح تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔[۱۱]

ان شرائط چہارگانہ کی تفصیل اور وضاحت کے بعد مولانا اکبرآبادی فرماتے ہیں:

''اس موقع پر یہ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ قرآن مجید کی مثال جدید زمانہ کی کسی مرتب ومہذب قانونی کتاب کی نہیں ہے جس میں تمام احکام مختلف ابواب اور پھر ہر باب کے ذیل میں مختلف دفعات کے ماتحت ترتیب اور ایک خاص نظم ونسق کے ساتھ بیان کردیے جاتے ہیں بلکہ اس کی مثال ایک طبیب حاذق کی سی ہے جو مریض کے لحہ بہ لحہ متغیر ہونے والے احوال کو دیکھ کر نسخہ میں ترمیم وتنسیخ کرتا رہتا ہے اور یا وہ فوج کے اس قائد کی طرح ہے جو طریق جنگ کی مصلحتوں اور فریق مخالف کی مورچہ بندیوں اور اصول اقدام وتاخر کے پیشِ نظر کبھی فوج کو کسی محاذ پر لڑنے کی ہدایت کرتا ہے اور کبھی دوسرے محاذ پر جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے، کبھی وہ تلوار استعمال کراتا ہے اور کبھی بندوق یا توپ، کبھی وہ آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے اور کبھی فوج کو مصلحتاً پیچھے ہٹاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب احکام اپنی اپنی جگہ نہایت ضروری اور واجب العمل ہیں۔ سطحی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک حکم دوسرے حکم کے منافی ہے یا ایک نسخہ دوسرے کی ضد ہے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باہمی تضاد اور منافات کے باوجود ان میں کا ہر ایک حکم اور نسخہ اپنے مخصوص موقع ومحل کے اعتبار سے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ دوسرا اپنے موقع ومحل پر۔ اگر ایک کو دوسرے کی جگہ پر رکھ دیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز تباہی اور بربادی کے اور کیا ہوسکتا ہے اور حق یہ ہے کہ جو دین دنیا میں آخری بن کر آیا ہو اس میں ایسی لچک اور تنوع احکام ہونا ضروری ہے۔[۱۲]

اس کتاب کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں زیر بحث مسئلہ کے تمام جزئی و کلی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مثلاً مسئلہ نسخ قرآن کے ضمن میں تمام عربی امہات کتب و مصادر سے استفادہ کرکے فاضل مصنف نے ان کے مباحث کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ اس

ضمن میں خاص طور پر علامہ ابو بکر جصاص (م۹۸۰ء)، علامہ ابن حزم (م۱۰۲۷ء)، ابن عربی (م۱۱۴۸ء)، حافظ ابن قیم (م۱۳۵۰ء)، جلال الدین سیوطی (م۱۵۰۵ء)، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م۱۷۶۲ء)، شاہ عبد العزیز دہلوی (۱۸۲۸ء) علامہ محمود آفندی آلوسی (م۱۸۵۳ء)، اور مفتی محمد عبدہ (م۱۹۰۵ء) رحمہم اللہ کی قیمتی آراء پیش کی گئی ہیں مزید برآں مولانا اکبر آبادی قرآنی علوم کے ماہرین کے اقوال نقل کر کے راجح و مرجوح کا فیصلہ قاری کی صوابدید پر چھوڑنے کے بجائے بالعموم اپنی ترجیحی رائے ظاہر کر دیتے ہیں۔ چنانچہ مسئلہ نسخ قرآن پر مفصل گفتگو کے بعد آخر میں رقم فرماتے ہیں:

> ''نسخ کے اصل مفہوم کی جتنی تنقیح ہوتی رہی، آیات منسوخہ میں اسی کے مطابق کمی واقع ہوتی رہی، یہاں تک کہ یہ حقیقت خود بخود واضح ہوگئی کہ دراصل قرآن مجید میں ایک آیت بھی منسوخ نہیں ہے، یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہماری تقریر سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم نسخ کے قائل بالکل ہی نہیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جس مذہب میں اشخاص اور قوموں کی تدریجی حالات ونفسیات کے مطابق اصلاح کا اصول پیش نظر رکھا گیا ہو اس میں نسخ کا ہونا ناگزیر ہے۔ نسخ کی دو قسمیں ہیں: نسخ آیات اور نسخ احکام، ہم اس میں سے دوسری قسم کے نسخ کے قائل ہیں''[۱۳]

فہم قرآن کے لیے تفسیر و تاویل میں فرق کی اہمیت:

حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے فرق کو اگر ملحوظ نہ رکھا جائے تو ''وضع الشي في غير محله'' کا ارتکاب ہوگا، چنانچہ اس موقع پر ضروری ہے کہ تفسیر و تاویل کا فرق بھی معلوم کر لیا جائے۔ تفسیر ''فسر'' سے مشتق ہے جس کے معنی کھولنے اور بیان کرنے کے ہیں۔ اور تاویل کا مادۂ اشتقاق ہے ''اَوْل'' جس کے معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ امام راغب اصفہانی تفسیر و تاویل میں عام و خاص، مطلق و مقید کی نسبت بتاتے ہیں

اور فرماتے ہیں کہ تفسیر کا اطلاق بیشتر الفاظ ومفردات کلام پر ہوتا ہے اور تاویل کا جملوں اور معانی پر اور دوسرا فرق یہ بیان کرتے ہیں کہ تاویل عموماً کتب الٰہیہ میں ہوتی ہے اور تفسیر کتب الٰہیہ وغیر الٰہیہ دونوں میں۔ ابو طالب الثعلبی کہتے ہیں کہ تفسیر کے معنی لفظ کی وضع کا بیان کر دینا ہے خواہ وہ حقیقت ہو یا مجاز مثلاً ''صراط'' کے معنی راستہ، ''صیب'' کے معنی بارش اور کفر کے معنی انکار۔ تاویل کہتے ہیں باطنِ لفظ کی تفسیر کرنے کو۔ گویا تاویل کے معنیٰ ہیں حقیقتِ مراد کی خبر دینا اور تفسیر کے معنی ہیں دلیلِ مراد کی خبر دینا، کیونکہ لفظ کاشفِ مراد ہونے کے لحاظ سے دلیل مراد ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے ''إن ربک لبالمرصاد'' اس کی تفسیر تو یہ ہے کہ ''مِرصاد'' رصد سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں گھات میں رہنا اور نگرانی رکھنا اس لیے مطلب یہ ہوا کہ تمہارا رب تمہارے اعمال کی دیکھ بھال رکھتا ہے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ ہم کو برے اعمال سے بچنا چاہیے اور احکام خداوندی کی تعمیل میں تکاسل وتہاون سے کام نہ لینا چاہیے۔ بعض لوگوں نے اس مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قرآن مجید میں جو چیز بیان کی گئی ہے اور صحیح سنت میں جس کی تعیین کی گئی ہے اس کو ظاہر کر دینا تفسیر ہے... اور تاویل ان احکام کو کہتے ہیں جن کا استنباط وہ علماء کرتے ہیں جو خطاب کے نشیب وفراز سے پوری طرح باخبر ہیں اور جو علوم وفنون میں مہارت تامہ رکھتے ہیں''، اپنی بات کی مزید وضاحت کے لیے علامہ بغوی کا قول ''الاتقان فی علوم القرآن'' کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے: ''تاویل آیت کا لوٹا دینا ہے ایک ایسے معنی کی طرف جو ماقبل اور مابعد کے موافق ہو اور وہ معنی قرآن وسنت کے مخالف نہ ہوں اور ایسے معانی پیدا کرنا از راہ استنباط ہوگا''۔[۱۴] اس مسئلہ پر مولانا اکبر آبادی کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر وتاویل کا دارومدار بڑی حد تک علم لغت، معانی اور ادب پر ہے۔ مگر تاویل یعنی قرآن مجید کی آیت کا مصداق متعین کرنے کے لیے صرف ان ہی علوم کی ضرورت نہیں بلکہ ضروری ہے کہ تاویل کرنے والا شریعت کے اسرار وحکم، رموز وغوامض اور اس کے احکام ومسائل سے پوری طرح واقف ہو اور استنباطِ مسائل کے جو اصول ہیں ان میں مہارت وکمال کا مرتبہ رکھتا ہو، اس واقفیت کے بغیر قرآن مجید کو سمجھنے

کی سعی کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص امرأ القیس کے اشعار کو جاہلیت کی تاریخ، معاشرت، تہذیب وتمدن، روایات، مزعومات وتوہمات کو جانے پہچانے بغیر سمجھنا چاہے''۱۵

قرآن وسنت کا باہمی ربط:

مصنف گرامی نے فہم قرآن میں حدیث سے استفادہ کی اہمیت واضح کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سنت کے بغیر آیات قرآن کا صحیح مصداق ومدلول متعین نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی مثالیں دیتے ہوئے وہ فرماتے ہیں ''قرآن نے صرف یہ بتایا کہ نکاح حلال ہے اور زنا حرام لیکن نکاح غیر مشروع کون کون سے ہیں قرآن میں اس کا تفصیلی حکم نہیں ہے، قرآن میں صرف ربوٰ کی حرمت کا ذکر ہے لیکن نہیں معلوم کہ ربا سے مراد کیا ہے اور اس کی حرمت کا مدار کسی چیز پر ہے، قرآن میں دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے اس کے علاوہ بھانجی اور خالہ، بھتیجی اور پھوپھی ان دونوں کو بھی اگر نکاح میں جمع کر دیا جائے تو قطع رحم لازم آتا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے ان کو نکاح میں جمع کرنے کی حرمت کا اعلان کیا۔ ان مثالوں کے بعد مصنف گرامی رقمطراز ہیں: ''قرآن کو سمجھنے کی کوشش میں سنت سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے تو قرآن مبہم اوامر ونواہی اور قصص کا ایک مجموعہ ہوکر رہ جائے گا اور اسلام کے مکمل ومفصل دستور اساسی ہونے کی حیثیت بڑی حد تک باطل ہوجائے گی مثلاً ''اقیموا الصلوٰۃ'' کے معنی ومصداق کی تحقیق میں اگر سنت سے مدد نہ لی جائے تو اس حکم میں عجیب قسم کا انتشار نظر آئے گا..... ایک صلوٰۃ ورکوع ہی پر کیا موقوف ہے، زکوٰۃ، حج، اوقات وارکان صلوٰۃ وربوا وغیرہ کی صحیح حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی اور پورے قرآن کو پڑھنے کے بعد بھی عبادات ومعاملات کا کوئی مکمل جماعتی نقشہ مرتب نہیں ہوسکتا۔ ۱۶

حدیث کا تاریخی استناد اور وضع حدیث کے اہم اسباب:

فہم قرآن کے ارتقاء میں حدیث کے کردار سے بحث کرتے ہوئے مولانا اکبرآبادی نے احادیث وآثار صحابہ کی تدوین اور محدثین کے عظیم کارناموں پر بھی تفصیل

سے روشنی ڈالی ہے تاکہ مصدر شریعت کا یہ قیمتی باب ہر طرح کے شکوک سے پاک ہو سکے، ظاہر ہے کہ مجموعہ احادیث سے استناد کے بغیر قرآن کے افہام وتفہیم کی راہیں دشوار ہو جائیں گی، مصنف گرامی نے روایت ودرایت پر تاریخی حقائق کا انکشاف کرتے ہوئے بعض قدیم ترین مجموعوں کا ذکر کیا ہے مثلاً مجموعہ ابوبکرؓ، مجموعہ عبداللہ بن عمرؓ مجموعہ علم الفرائض از زید بن ثابتؓ۔ اس سلسلے میں انہوں نے وضاحت کے ساتھ علم حدیث میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی گہری دلچسپی کا ذکر کیا ہے جو تحریک تدوین حدیث کا باعث بنی۔ عباسی دور کے ان منتخب اکابر کے اسماء گرامی بھی گنائے ہیں جنہوں نے تدوین حدیث میں خصوصی دلچسپی لی۔

دوسری اہم بات یہ کہ دوسری صدی ہجری کے اختتام پر اقوال صحابہ اور فتاویٰ تابعین سے الگ کر کے احادیث کے مجموعے تیار کرنے کی خدمات انجام دی گئیں۔ اس باب میں امام احمد بن حنبلؒ، اسحٰق بن راہویہؒ اور عثمان بن ابی شیبہؒ کے نام نمایاں ہیں، تیسری صدی ہجری کا زمانہ تدوین حدیث کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسانید کو محفوظ رکھنے اور ان کی صحت وسقم کی تحقیق وتفتیش کا اہتمام ہونے لگا اور علم اسماء الرجال (علم جرح وتعدیل) کے نام سے ایک مستقل فن کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس دور میں صحاح ستہ کی ترتیب وتدوین بجا طور پر حدیث کا بے نظیر کارنامہ ہے۔ معروف جرمن اسکالر ڈاکٹر اسپرنگر نے "الاصابہ فی تمییز الصحابہ" کے دیباچے میں تحریر کیا ہے: نہ کوئی قوم ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ ۱۷

زیر مطالعہ کتاب میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے وضع حدیث کے تین اہم اسباب کی نشاندہی کی ہے۔ اول یہ کہ سیاسی جھگڑے مثلاً حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلافات کی وجہ سے خوارج اور شیعہ کے دو فرقے وجود پذیر ہوئے۔ دوم یہ کہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں کلامی وفقہی مناظروں نے قرآن وحدیث کو تختۂ مشق بنایا اور سوم یہ کہ شخصی حکمرانوں کو خوش کرنے کی خاطر وضع حدیث کا مشغلہ شروع ہوا۔ ۱۸

قرآن کی تفسیر خود قرآن سے:

مولانا اکبر آبادی نے تدبر قرآن کے لیے ''القرآنُ یُفسّر بعضُہ بعضا'' کو فن تفسیر کا اہم اصول قرار دیا ہے۔ قدیم و جدید علماء تفسیر میں اس اصول کے متعدد قائلین پائے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی میں مولانا امین احسن اصلاحی شاگرد رشید علامہ حمید الدین فراہیؒ نے تدبر قرآن میں اس اصول کو اکثر مقامات پر برتنے کی کوشش کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تدبر قرآن سے کچھ مثالیں فراہم کردی جائیں تاکہ بات مدلل ہوجائے، بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تفسیر میں لکھتے ہیں: دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تعلیم انسان کو بالکل شروع ہی میں دی ہوگی چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق خود قرآن مجید میں یہ نقل ہے کہ انہوں نے اپنے باایمان متعلقین اور اپنے ساتھیوں کو جب کشتی میں سوار کرایا تو اسی وقت اس سے ملتے جلتے الفاظ کہے: قال ارکبوا فیھا بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا ان ربی لغفور رحیم (ھود/۴۱)، اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو جو نامہ لکھا اس کا آغاز بھی انہی مبارک کلمات سے کیا چنانچہ قرآن مجید میں ہے: إنہ من سلیمان وإنہ بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم (نمل/۳۰)

''مالک یوم الدین'' میں ''دین'' کے چار معانی مولانا اصلاحی نے بیان فرمائے اور چاروں معانی کے لیے قرآن سے چار نظائر پیش کیے۔ مذہب وشریعت کے معنی میں (آل عمران/۸۳)، ملکی قانون کے لیے (یوسف/۷۶)، اطاعت کے معنی میں (نحل/۵۲)، جزاء کے معنی کے لیے (ذاریات/۶)۔ سورۃ النصر کی تفسیر میں مولانا فرماتے ہیں کہ الفتح سے مراد موعود منتظر فتح ہے جو اللہ کے رسولوں اور ان کے ساتھیوں کے لیے سنت الٰہی کا تقاضا ہے، اس فتح کا حوالہ سورۃ الصف میں اس طرح ملتا ہے: واخریٰ تحبونھا نصر من اللہ وفتح قریب (آیت نمبر ۱۳) سورۃ الحدید (آیت ۱۰) میں اس کا ذکر اس طرح ہے لا یَستَوِیُ مِنکُم مَّنُ أنفَقَ مِن قَبلِ الفَتحِ وَقَاتَل۔ ان مثالوں سے مقصود اس جانب متوجہ کرنا ہے کہ مولانا اکبر آبادی نے تفسیر قرآن کے لیے جس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے

مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے ''تدبر قرآن'' میں مختلف آیات کی تفسیر میں اس اصول کو بحسن وخوبی نافذ کرنے کی سعی بلیغ فرمائی ہے۔ مولانا اکبر آبادی اس کتاب میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

> ''اس طرح اگر قرآن مجید کے کسی لفظ کی مراد کو متعین کرنے کے لیے خود قرآن مجید سے مدد لی جائے تو غالباً وہ اختلاف وتشتت نہ پیدا ہو جو عموماً تفسیروں میں نظر آتا ہے اور نہ وہ گمراہی پیدا ہو جو خود قرآن مجید کے طرزِ خطاب وطریقہ بیان سے واقفیت ومناسبت بہم پہنچائے بغیر کسی آیت کی تفسیر سے پیدا ہوتی ہے''[۱۹]

صاحبِ ''فہم قرآن'' اس اصول کی وضاحت میں قرآن کی یہ آیت کریمہ نقل کرتے ہیں: وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ أَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ فَمَن تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقَى وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (البقرہ/۲۰۳)

(اور تم چند گنے چنے دنوں میں اللہ کو یاد کرو اور جس شخص نے دو ہی دنوں میں جلدی کی اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اور جس نے تاخیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے یہ ان کے لیے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ تم اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم اس کے پاس جمع ہوگے)

اور فرماتے ہیں کہ اس آیت پر متعدد اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں:

اول: لغت میں ذکر کے معنی فقط یاد کرنے کے ہیں تو یہاں پر ذکر سے مراد ایک مخصوص فعل عبادت (رمی جمار) کیونکر مراد لیا جائے۔

دوم: معدودات جمع قلت کا صیغہ ہے جو تین سے نو تک کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس میں چند خاص دنوں کا ذکر نہیں ہے۔ اگر اس پر الف لام تعریف کا داخل ہوتا تو اس کو عہد کا مراد لے کر تخصیص پیدا کر سکتے تھے لیکن ایام اور معدودات دونوں نکرہ ہیں۔ پھر ان سے کیونکر چند خاص دن مراد ہو سکتے ہیں۔ پس اگر کسی شخص نے سال کے چند غیر معین ایام میں بھی خدا کو کسی طرح یاد کر لیا تو اس نے اس آیت کا حکم پورا کر دیا۔[۲۰]

مولانا اکبر آبادی ان اعتراضات کا جواب ان الفاظ میں دیتے ہیں:

''بیشک لغت میں ذکر کے معنی یاد کرنا ہی ہے لیکن قرآن مجید کا یہ انداز خاص ہے کہ وہ خاص خاص عبادتوں کا نام لیتا ہے، بلکہ ان کی جو اصل روح ہے اس کا ذکر کر دیتا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس عبادت کی اصل غرض معلوم ہو جائے اور وہ اس سے کسی وقت بھی غافل نہ ہوں..... اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت زیر بحث یعنی **واذکروا اللہ فی ایام معدودات** میں چونکہ ذکر کو ''ایام معدودات'' کے ساتھ مقید کیا گیا ہے اس لیے یہاں ذکر سے مراد صرف زبان وقلب سے یاد کر لینا نہیں بلکہ مخصوص طریق عبادت ہے۔ وہ کیا ہے؟ رسول اکرم ﷺ نے اس کو اپنے اقوال مبارکہ اور عمل مقدس سے واضح کر دیا کہ وہ رمی جمار ہے۔ اس طرح ایام معدودات کے سلسلے میں حضور ﷺ نے فرمایا تم ایام تشریق میں رمی جمار کرو چنانچہ اب ظاہری مفہوم فہم قرآن سے بُعد پیدا کر دے گا''۔[۲۱]

اوپر کی پوری بحث میں مصنف گرامی نے سب سے پہلے آیت کریمہ نقل کرنے کے بعد بعض اعتراضات نقل کیے اور پھر جواب دینے سے قبل پورے قرآن میں مستعمل لفظ ''ذکر'' پر غور فرمایا ہے۔ مثلاً فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ (البقرۃ/۱۹۸)، فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (البقرۃ/۲۳۹)، وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (الجمعہ/۱۰) وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزمل/۸) رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ (النور/۳۷) مولانا کی پختہ رائے یہ ہے کہ اس عمل وطریقہ کار کے نتیجے میں ایک شخص تفسیر کے باب میں بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

''فہم قرآن'' کی خصوصیات:

۱۔ اس کتاب میں مولانا اکبر آبادی مختلف فیہ تفسیری مسائل میں اقوال سلف نقل کرنے کے بعد راجح قول کی نشاندہی فرماتے ہیں۔ اس کتاب کا انداز بحث ان کے

اجتہادی ذوق کا آئینہ دار ہے۔ یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اولـمستـم النساء (النساء/٦) کے مفہوم و مصداق میں علماء کی مختلف آراء ہیں۔ایک طبقہ کی رائے یہ ہے کہ ملامسہ سے مراد محض بدن کا چھونا ہے۔مباشرت مراد نہیں ہے جب کہ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اس سے مباشرت مراد ہے۔دونوں آراء کے حاملین نے اپنے اپنے دلائل دیے ہیں اس مسئلے میں مولانا اکبرآبادی کا موقف ملاحظہ فرمائیں:

''ہمارے خیال میں اس موقع پر اس بحث میں پڑنا کہ ''لمس'' کے معنی حقیقی کیا ہیں اور معنی مجازی کیا؟ اور پھر معنی مجازی اس وقت تک مراد نہیں لیے جاسکتے جب تک کہ معنی حقیقی کے مراد لینے میں تعذّر نہ ہو، چنداں مفید مطلب نہیں۔ بلکہ ضرورت یہ دیکھنے کی ہے کہ ''لمس'' اور اس کے ہم معنی لفظ ''مس'' لغت کے اعتبار سے کس معنی میں مستعمل ہوتے ہیں، یہ معلوم کرنے کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں کتنے مقام پر آئے ہیں اور وہاں ان سے کیا مراد لی گئی ہے۔اس سلسلے میں تحقیق وتلاش سے کام لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ زن وشوئی کے تعلقات بیان کرنے میں قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے کہ وہ ان مواقع پر تصریح سے کام نہیں لیتا بلکہ کنایۃً ان چیزوں کو بیان کرتا ہے مثلاً ایام حیض میں مجامعت سے منع کرنا منظور تھا تو فرمایا گیا فاعتزلوا النساء فی المحیض ۔اس مقام پر انہوں نے قرآن مجید میں اس لفظ کے متعدد استعمالات کی تشریح کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''لمستم النساء''میں لمس سے مراد محض چھونا نہیں ہے۔''[۲۴]

ایک دوسری مثال میں مولانا اکبرآبادی ''تقویٰ'' کو معراجِ علم قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''علم کی تعریف میں اختلاف پیدا ہوا۔کوئی اس کو حصول صورت کہتا ہے، کسی کے نزدیک حاضر عند المدرِک کا نام علم ہے اور کوئی قوت مدرکہ کو ہی علم بتاتا ہے اور کسی کے خیال میں ایک معنی اضافی ہے جو عالم اور معلوم کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ حکماء اشراقیین فرماتے ہیں علم ایک نور ہے، جو اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں پیدا کر دیتا ہے اور وہ معلومات

کے ادراک کا منشا بنتا ہے۔ ہماری رائے میں یہی قول درست ہے اور اسلامی نقطۂ نظر بھی اس کی تائید کرتا ہے، اس موقع پر انہوں نے امام شافعیؒ کے دو مشہور شعر پیش کیے ہیں:

شکوتُ الی وکیع سوءَ حفظی فاوصانی الی ترک المعاصی

لانّ العلم نور من اللہٖ ونور اللہ لا یعطی لعاصٍ ۲۳

(یعنی میں نے اپنے استاد وکیع سے اپنے بدحافظہ ہونے کی شکایت کی تو انہوں نے گناہوں کے ترک کردینے کی ہدایت فرمائی اور کہا کہ علم خدا کا نور ہے جو کسی گناہگار کو نہیں دیا جاسکتا)

آخر میں مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن کی تصریح کے مطابق نفس انسانی میں یہ جلا اور نورانیت اعمال صالحہ اور تقوی وطہارت سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے بعد اس میں ایسی صلاحیت پروان چڑھتی ہے کہ وہ قرآن مجید کی روحانی تعلیمات کی حقیقی غرض وغایت کو سمجھ سکے اور اس کے مطالب کو کماینبغی جان سکے۔ ۲۴

۲۔ ''فہم قرآن'' کے مباحث کے ضمن میں مصادر ومراجع کا اہتمام مصنف گرامی کے تحقیقی واجتہادی ذوق کا عکاس ہے۔ عقلی ونقلی دلائل کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو اشعار اور ممتاز علماء ومعروف اسکالرز کی منتخب آراء کے ذکر سے اپنے مباحث کو مزید مستحکم کیا ہے۔ بوقت ضرورت کسی مسئلہ پر متعدد حوالے پیش کرتے ہیں اور طویل سے طویل عبارت بلا تکلف نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح زیر بحث مسئلہ کو بالکل منقح کردیتے ہیں۔ اس کتاب کے حواشی قیمتی ومفید معلومات سے معمور ہیں۔

۳۔ مولانا اکبرآبادی صاحب طرز ادیب بھی ہیں اگرچہ ابتدائی علمی زندگی میں آپ نے علامہ شبلی نعمانی، حضرت داغ دہلوی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں سے استفادہ کیا تھا لیکن بہت جلد آپ نے نظم ونثر میں اپنی انفرادیت قائم کرلی۔ آپ کی اردو تحریریں ادب عالیہ کے مختلف اسالیب کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جابجا فصاحت وبلاغت کا دریا بہتا ہوا محسوس ہوتا ہے رمز وکنایہ، تشبیہ واستعارہ، اور بذلہ سنجی کے بے شمار نمونے نظر آتے ہیں، اسی طرح عربی وفارسی الفاظ وتراکیب اور استعاروں کے استعمالا بھی بہت برمحل معلوم ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ''فہم قرآن'' میں اصول تفسیر کے آداب وشرائط بڑے اچھے انداز میں واضح کیے گئے ہیں۔ تفسیر بالرای کی راہ میں حدود وقیود اور خطرات ومہلکات کی وضاحت بھی اس کے مباحث کا ایک اہم پہلو ہے۔ فاضل مصنف نے کتاب ہدایت کی حیثیت سے قرآن کے مقام ومرتبہ کو واضح کرتے ہوئے اعتراضات وشبہات کو رفع کیا ہے اور ناقدین قرآن وسنت بالخصوص مستشرقین کو اپنے مدلل جواب سے مطمئن کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ اس طرح فہم قرآن کے طور وطریق کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب اہمیت وافادیت سے بھرپور ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی حیات وعلمی خدمات پر تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں، سعید احمد اکبرآبادی، برہان، دہلی، جون ۱۹۸۴ء، نظرات ص ۵-۱۶۔ پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، فکر ونظر، خصوصی شمارہ، نامورانِ علی گڑھ، جلد دوم، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۳۲۹، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، احوال وآثار، مجموعہ مقالات سمینار منعقدہ ۲۸-۲۹/اگست ۲۰۰۳ء (مرتبہ سعود عالم قاسمی) شعبہ دینیات، علیگڈھ مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ ۲۰۰۵ء، ص ۹-۱۲-۲۵، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، وفیات بعنوان: ''مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی یاد میں'' معارف جولائی ۱۹۸۵ء، ص ۶۹۔

۲۔ سعید احمد اکبرآبادی۔ فہم قرآن، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی (طبع ثانی) ۱۹۴۵، ص ۱۱

۳۔ تفسیر تدبر قرآن سے قبل مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے فہم وتدبر قرآن سے متعلق بعض مقالات تحریر فرمائے جس کا پہلا ایڈیشن چراغ راہ، کراچی سے 'تدبر قرآن' کے عنوان سے ۱۹۵۱ میں شائع ہوا تھا پھر یہی بعد میں ''مبادی تدبر قرآن'' کے عنوان سے طبع ہوا۔

۴۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۱۷-۱۸

۵۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۲۰

۶۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۲۴

۷۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۲۹

۸۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۳۹-۴۰

۹۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۳۸

۱۰۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۴۰-۴۱

۱۱۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۴۶-۵۲

۱۲۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۵۲

۱۳۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۶۲-۶۳

۱۴۔ جلال الدین سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن (تصحیح وتزئین مولانا محمد عبدالحلیم چشتی ومعراج محمد بارق) اصح المطابع وکارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی (غیر مورخہ) جلد دوم ص ۵۴۸

۱۵۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۷۰

۱۶۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۸۲

۱۷۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۱۵۲، نیز دیکھیے علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، مطبع معارف، دارالمصنفین اعظم گڑھ، طبع ہشتم ۱۹۷۴ء، جلد اول ص ۳۹۔ تقی الدین ندوی مظاہری، فن اسماء الرجال، مکتبہ فلاح دارین، گجرات ۱۹۶۹ء، ص ۳۴-۷۲، علوم الحدیث- مطالعہ وتعارف، مجموعہ مقالات سیمینار منعقدہ مقامی جمعیت اہلحدیث، علی گڑھ، ۱۹۹۹ (مرتبہ رفیق احمد سلفی) ص ۲۷۴-۲۸۲۔

۱۸۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۱۰۷-۱۰۸

۱۹۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۴۸

۲۰۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۴۴-۴۵

۲۱۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۵۱

۲۲۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۴۷

۲۳۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۴۴-۴۵۔ دیوان الشافعی (تحقیق وتعلیق، زیدی یکن) دارالثقافہ، بیروت، لبنان ۱۹۶۱ء کے صفحہ ۱۱۴ پر امام شافعی کا یہ شعر بعض لفظی تبدیلی کے ساتھ اس طرح مرقوم ہے

شکوت الی وکیع سوءَ حفظی — فارشدنی الی ترک المعاصی
واخبرنی بان العلم نور — ونور اللہ لایھدی لعاصِ

۲۴۔ فہم قرآن، محولہ بالا، ص ۴۵